کیا اسلام پسندی کی گھن گرج ختم ہو رہی ہے ؟☆

میکس روڈن بیک

پندرھویں صدی ہجری کے پہلے روز ۲۱ نومبر ۱۹۷۹ء کو ایک پُراسرار ''اسلامی'' تنظیم کے ۳۰۰ ارکان نے خانہ کعبہ پر بزور قبضہ کر لیا۔ دو ہفتے کے بعد ایک مسلح کارروائی کے ذریعے جس میں ان میں سے اکثر باغیوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا، یہ قبضہ ختم کر دیا گیا۔ باقی ماندہ چند باغیوں کے سر قلم کر دیے گئے۔ اس طرح یہ افسوس ناک سانحہ تاریخ کے اوراق میں گم ہو گیا۔

بعد میں اس واقعے کے کئی مضمرات سامنے آئے۔ خانہ کعبہ پر حملہ آوروں کے عقائد تو مسلمانوں کے دلوں میں راہ نہ پا سکے البتہ ان کی طاقت کے مظاہرے سے نئی نسل کے موڈ کا پتہ چلتا ہے۔ اِس نسل کا سامنا جدیدیت سے تھا۔ یہ نسل عالم اسلام میں جاری صورت سے غیر مطمئن اور نالاں ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ مسلمانوں پر روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا ازالہ کر کے دنیا میں اپنے لئے جائز مقام حاصل کرنا چاہتی تھی۔

غیر مسلموں کو جلد ہی مسلمان نوجوان نسل کی ناراضگی کے اظہار کے شواہد دیکھنے کو ملے۔ ایک سال نہ گزرا تھا کہ ایران میں انقلاب آ گیا، افغانستان میں روسی حملے کے خلاف جہاد کا آغاز ہو گیا، دو سال نہ گزرے تھے کہ مصر میں دینی جذبے سے سرشار لوگوں نے انور سادات کو قتل کر دیا۔ اسّی کے عشرے کے وسط تک فلپائن سے لے کر بیروت تک مسلمان نوجوان اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر گوریلا طریق جنگ سے مصروف جہاد ہو گئے، جن کا مطمح نظر مخالفین اسلام کا قلع قمع کر کے اسلامی قوانین کا نفاذ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دین جس کا ایک صدی تک عالمی سٹیج پر کردار معدوم تھا، یک بیک ابھر کر دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

ایک عشرہ بیشتر بعض مغربی مفکرین نے یہ خیال ظاہر کرنا شروع کیا کہ مغربی تہذیب کے لئے اشتراکی خطرے کے خاتمے کے بعد احیائے اسلام خطرہ ثابت ہو گا۔ حماس اور حزب

☆Max Rodenbeck, "Is Islamism Losing Its Thunder?", *The Washington Quarterly*, Spring 1998, PP.177-193 (تلخیص: پروفیسر نیاز عرفان)

اللہ کا عروج، الجزائر میں اسلام پسندوں کی کامیابی اور نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم دھماکہ جیسے واقعات نے ان خدشات کو تقویت بہم پہنچائی کہ اسلام کے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال سے اک غیر مختتم لہر کا آغاز ہو چکا ہے۔

جب اسلام پسندوں کا ان کے بیانات، تشدد اور شدت پسندی سے الگ کر کے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اکثر مسلم ممالک میں وہ دھواں دھار تقریریں کرنے کے باوجود اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ اسلامی قوانین کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن انہیں عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہو سکی۔ سوڈان اور ایران کا، جہاں اسلام پسندوں نے اقتدار حاصل کر لیا ہے، ان کی سرحدوں سے باہر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ ایران میں اقتدار لادین قوتوں کے ہاتھ میں چلے جانے کا امکان پیدا ہو رہا ہے۔

اس کے باوجود عالمی سطح پر اسلام کے اثرات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مراکش سے ملاکا تک کاروبار حیات میں اسلام کے کردار کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ ہر جگہ اور ہر شعبہ حیات میں احیائے اسلام کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ جمعے کی نماز میں حاضری بڑھ گئی ہے۔ لباس میں ماضی کی وضع قطع دوبارہ رائج ہو رہی ہے، سکہ سازی، قومی شناختی علامات کے انتخاب اور سرکاری عمارتوں کے طرز تعمیر میں روحِ اسلام کی نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ اب ہر جگہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا ہے کہ وہ ثقافتی، معاشی اور عسکری میدانوں میں شدید مخالفِ اسلام قوتوں کے نرغے میں ہیں۔

اسلام بطور عقیدے یا نظریے اور اسلام بطور سیاسی منشور کے مابین فرق موجود ہے۔ اسلام پسند سمجھتے ہیں کہ سیاسی اقتدار کے بغیر اسلام پر عمل نامکمل ہو گا۔ ان کے تصور اسلام کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سے دو کی نشان دہی کی جا سکتی ہے یعنی انقلابی اسلام اور تبلیغی یا تہذیبی اسلام۔ اگرچہ دونوں نقطہ ہائے نظر کا مطمح نظر تو ایک ہی ہے یعنی نفاذ اسلام، تاہم ان کے طریق کار میں شدید اختلاف کے باعث وہ ایک دوسرے کے مد مقابل بن سکتے ہیں۔ پہلے گروہ کی نظر میں مسلم معاشرے دین سے دور ہٹ کر دور جاہلیت میں چلے گئے ہیں جن کو راہ راست پر لانے کے لئے قوت کو استعمال میں لانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے گروہ میں ایسے جدت پسند مصلحین شامل ہیں (مثلاً مصر کے جج سعید عشماوی) جو شریعہ کو اخلاقی اصولوں کے ہم معنی سمجھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ کسی ملک کے آئین میں شریعہ کو بالادست قرار دینا اس کو اسلامی مملکت قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

اسلام پسندی کی تازہ لہر کے پیچھے اسلامی اصولوں کے عملی نفاذ کی خواہش سے زیادہ غیر

اسلامی، غیر ملکی قوتوں کے ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی غلبے کے خلاف مزاحمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں مقتدر قوتوں کے غیر جمہوری اقدامات نے اس جذبے کو تقویت پہنچائی ہے۔

مسلمانوں کی نئی نسل کو آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور شہروں میں منتقلی نے پریشان کیا ہے۔ مستزاد یہ کہ غیر ملکی مداخلت و جارحیت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا ہے۔ ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس نسل کے پاس موزوں ہتھیار نہیں ہیں۔ یہاں تعلیمی پالیسیوں کا مطمح نظر معیار تعلیم سے زیادہ مقدار تعلیم اور تخلیق کاروں سے زیادہ تکنیک کار پیدا کرنا ہے۔ اس ماحول نے احتجاج کو جنم دیا ہے اور اسلام کا احتجاج کے ہتھیار کے طور استعمال قابل فہم ہے۔ اگر مغربی طاقتیں یہ جان لیں کہ مسلمان معاشروں کو جدیدیت سے نمٹنے کے لئے خود اپنی راہ متعین اور منتخب کرنے کا حق ملنا چاہیے تو مغربی اقوام کے مفادات کو کوئی خطرہ نہیں۔

گم گشتہ رومان

حالیہ واقعات مثلاً افغانستان، الجزائر، یوروشلم اور ایران میں شدت پسندی کے مظاہر سے اسلامی انتہا پسندوں کی کامیابیوں کا گمان ہوتا ہے۔ طالبان نے خواتین کے تعلیمی ادارے بند کر دیے۔ پردے کی سخت پابندی عائد کر دی اور مردوں کے لیے داڑھی رکھنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ کامیابیاں یا تو سعودی حکومت سے موصول شدہ رقوم سے مخالفین کو رام کر کے ممکن ہوئیں یا اس لئے کہ افغانستان کی اکثریت پسماندہ دیہاتی لوگوں کی ہے۔

اسلامی عسکریت زوال پذیر ہے

تعلیم یافتہ شہری افغان، طالبان کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور پھر انہیں مصر، ایران اور ترکی میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایران میں خاتمی کے انتخاب سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہاں بھی انتہا پسندی زوال پذیر ہے۔ وہاں ادارے مضبوط ہو رہے ہیں۔ ترکی کی رفاہ پارٹی نے ایران طرز کی انتہا پسندی سے گریز کیا ہے۔ کوشش کے باوجود ابھی تک ایران اپنے عقائد کو ہمسایہ ممالک میں برآمد نہیں کر سکا۔ سمیع زبیدہ نامی عراقی مفکر رقمطراز ہے کہ اب ایران محض ظاہری طور پر مذہبی ہے، اندر سے اس میں کوئی خاص مذہبی رنگ نہیں۔ مثلاً جامعات میں معاشیات کو اسلامیانے کا فیصلہ ہوا، مگر عملاً معاشرے کی تعمیر کے لیے امریکی نمونہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اور سودی لین دین پر کوئی قدغن نہیں۔ قدامت پرستوں اور اعتدال پسندوں

میں مسابقت نمودار ہو کر اب اعتدال پسندوں کی فوقیت پر منتج ہو چکی ہے اور محمدؐ خاتمی جیسے اول درجے کے اعتدال پسند کو صدر منتخب کر لیا گیا ہے۔ مزید بر آں لوگ انتہا پسندی، نعرہ بازی اور باقی دنیا سے قطع تعلقی سے تنگ آ چکے تھے۔

خاتمی نے خمینی اور خامنائی کی روش کو ترک کرتے ہوئے مغربی ثقافت اور فکر کی طرف مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ چنانچہ مغرب میں ایران دوستی کا رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ اس کے انتخاب کے چند ہی ماہ بعد یورپی یونین کے ممالک نے ایران سے اپنے منقطع تعلقات دوبارہ استوار کر کے سفارت خانے کھول لئے۔ نہ صرف یہ کہ ایران نے اسلامی سربراہ کانفرنس کی مہمان نوازی کی اور سعودی عرب اور مصر جیسے مخالف ایران ممالک نے اپنے سفارتی تعلقات کا درجہ بڑھالیا، بلکہ امریکہ جیسے سخت دشمن ملک سے تجدید تعلقات کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔

اگرچہ ابھی تک قدامت پسند عناصر کا بیشتر ایرانی اداروں پر غلبہ موجود ہے، تاہم آہستہ آہستہ عوام میں خصوصاً نوجوان نسل میں مذہبیت سے دُوری پیدا ہو رہی ہے۔ مثلاً صرف تین فیصد نوجوان ٹی وی پر مذہبی پروگرام دیکھتے ہیں۔ مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا نظریہ جڑ پکڑ رہا ہے۔ اس طرح ایران میں مغرب سے مفاہمت کے واضح آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

اسلام پسندی کے لیے ایک راستہ

مقالہ نگار نے ایران کے ساتھ مصر میں اسلام پسند پارٹیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ۱۹۲۸ء میں قائم شدہ اخوان المسلمون کو ایک مہذب تحریک قرار دیا ہے، جس نے سن اسّی کے عشرے میں پارلیمان میں کچھ نشستیں بھی حاصل کر لی تھیں۔ لیکن حکومت نے جماعہ اسلامیہ کو ایک متشدد پارٹی قرار دیا، جس نے نومبر ۱۹۹۷ء میں لکسر میں ۵۸ یورپی سیاحوں کا قتل عام کر کے نہ صرف اپنے آپ کو بدنام کر لیا بلکہ تحریک اسلامی کو بھی زک پہنچائی۔ اس طرح عوام کی نظروں میں اسلامی تحریکوں کے خلاف حکومت مصر کے جور و ستم کو جواز فراہم کر دیا۔ دراصل یہ پارٹی طلباء کی تحریک کے طور پر ابھری لیکن حکومتی استبداد کے خلاف رد عمل نے اسے اور دیگر اسلام پسند پارٹیوں کو مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ حکومت مصر بھی آہستہ آہستہ آمرانہ راستے پر چل پڑی ہے۔ مصنف کی رائے میں جماعہ اسلامیہ حکومت کے جبر وجور کے جواب میں مزید تشدد کی راہ اپنا کر دراصل یورپی ریڈ بریگیڈ کی مانند مزید حکومتی جبر وجور کو دعوت دیتی ہے تاکہ عوام میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

مصر میں امن پسند اسلامی تحریک کی کامیابی کے بہتر امکانات ہیں اور وہ کامیاب ہو رہی ہے۔ اس تحریک نے عوامی خدمت اور معاشرتی بہبود کے کاموں کے ذریعے اور پرامن تبلیغ کے ذریعے نہ صرف معاشرے میں وسیع اثر و نفوذ حاصل کر لیا ہے۔ بلکہ خود حکومتی اور فوجی حلقوں میں اپنے ہمدرد پیدا کر لئے ہیں۔ حکومت ان کی امداد بھی کرتی ہے۔ فوج جسے لادینی تصور کیا جاتا رہا ہے اپنے اسلامی پروگرام چلا رہی ہے۔

حکومت مصر نے اپنے آپ کو ''مسلم'' (نہ کہ ''اسلامی'') ظاہر کر کے عوام کو انتہا پسندی کا مخالف بنا دیا ہے۔ ۱۵ سال کی معاشی تنگدستی کے بعد مالی حالات بہتر ہو گئے ہیں۔

اب اسلام پسند پارٹیاں آہستہ آہستہ خصوصی اسلامی نعروں کی بجائے صحیح معنوں میں جمہوریت کے نفاذ اور سفارش اور رشوت کے قلع قمع کے نعرے لگا کر عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔

تحریک مزاحمت کا اندورنی خلفشار

مصر کے تجربے کے برعکس اسرائیل کے زیر قبضہ فلسطینی مسلمانوں میں مزاحمتی اسلامی تحریک، اخوان المسلمون کی شاخ کے طور پر وجود میں آئی۔ خود اسرائیلی حکومت نے مسلمانوں میں اشتراکی اثر و نفوذ کو روکنے کے لئے اسے پنپنے دیا۔ (سوویت یونین کے خاتمے اور اشتراکی خطرہ ٹلنے کے بعد) مسلمانوں پر اسرائیلی ظلم و ستم نے حماس کو پھر تقویت دی۔ ۱۹۸۷ء-۱۹۹۳ء کے عرصے میں اچانک ''انتفادہ'' تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۸۸ء میں حماس کی بنیاد رکھی گئی۔ جو جلد ہی پی ایل او کے مدمقابل مضبوط تنظیم بن گئی۔ اور جس نے دنیا کی توجہ اسرائیلی مظالم کی طرف مبذول کروائی۔ اسرائیل اور پی ایل او کے مابین سمجھوتے کے بعد بھی فلسطینی اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اِس لئے اسلام پسندوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان میں بھی دو فریق بن گئے ہیں۔ ایک معتدل مزاج دوسرا متشدد۔ احمد] کی سربراہی میں حماس فلسطینی اتحاد کی خاطر پی ایل او سے ٹکراؤ سے بچتی رہی ہے، جبکہ دوسرا متشدد گروہ اسرائیل کے اندر متشددانہ کارروائیاں کرتا رہا ہے، جبکہ پی ایل او گفت و شنید سے فوائد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس معاملے میں متشدد اسلامی گروہ کا اسرائیل اور پی ایل او دونوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ اسی تناظر میں لبنان میں شیعہ تنظیم حزب اللہ وجود میں آئی جو اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کر رہی ہے۔ لبنان میں خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد حزب اللہ کا اندازِ جدوجہد بدل گیا ہے۔ اب یہ جمہوریت کے نفاذ کا مطالبہ کر

رہی ہے جس میں سارے مذہبی فرقوں کو منصفانہ نمائندگی مل سکے۔ اس تنظیم میں بھی معتدل اور متشدد دو گروہ بن رہے ہیں۔ اگرچہ ثانی الذکر پس منظر میں چلے جارہے ہیں۔

انتخابات میں ناکامیاں

طالبان، حماس اور حزب اللہ غیر معمولی حالات کی پیداوار تھیں اس لئے انہیں غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ جبکہ انتخابات میں اسلام پسند جماعتوں کو کوئی نمایاں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ مثلاً ترکی، پاکستان، یمن اور اُردن میں مجموعی طور پر ۳۰ فیصد سے زیادہ رائے دہندگان نے ساتھ نہیں دیا۔ اور یہ ووٹ بھی زیادہ تر برسر اقتدار مخالف پارٹیوں کی ناقص کارکردگی اور بد عنوانیوں سے لوگوں کی مایوسی کے نتیجے میں ملتے رہے۔

ترک ماہر عمرانیات نیلو فرگول کے خیال میں ترکی میں رفاہ پارٹی کو ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں کامیابی اسلام پسندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ محروم طبقوں کی نمائندگی کی وجہ سے ملی تھی۔ جب ۱۹۹۷ء میں فوج نے اسے جبراً اقتدار سے نکال باہر کیا تو اس پارٹی کے لئے وقتی ہمدردی کی لہر کے باوجود غیر رسمی رائے شماری (opinion poll) میں اسے صرف ۲۸ فیصد رائے دہندگان کی حمایت حاصل ہو سکی۔

الجزائر میں بھی اسلامی محاذ آزادی (FIS) کو ۱۳ ملین ووٹوں میں سے صرف ۲۵ء۳ ملین ووٹ ملے۔ اور نصف آبادی اسلامی ریاست کے حق میں نہیں۔ یہاں بھی اس پارٹی کی حمایت کی وجہ اسلام کی حمایت نہیں بلکہ لادین عناصر اور فوجی حکومتوں کی بد عنوانیوں، ظلم و جبر، معاشی بد انتظامی اور ثقافتی انتشار ہے۔

پاکستان میں اسلام پسندوں نے اپنے تجربے سے یہ سبق سیکھا کہ ''لا اِکراہ فی الدین'' کی قرآنی ہدایت کا اطلاق دین کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی ہوتا ہے۔ (گویا ان کو پتہ چل گیا کہ تشدد کی بجائے تبلیغ کا راستہ کامیابی کا راستہ ہے)۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلام کے نفاذ کا پروگرام اپنا کر اسلام پسندوں کو ان کے ہتھیار سے محروم کر دیا۔ لیکن جلد ہی ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ان کو معلوم ہوا کہ فوجی حکومت کے ساتھ ان کے تعاون اور پھر علاقہ پرست، نسل پرست اور لسانی پارٹیوں نے ان کی مقبولیت کو نقصان پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہیں قومی اسمبلی میں صرف ۹ نشستیں ملیں۔ جماعت اسلامی کے اندر اختلاف رائے پیدا ہوا۔

قومی انتخابات میں اسلام پسند جماعتوں کی اکثریت بعید الامکان

پاکستان میں اسلام پسند پارٹیوں کا نفاذ اسلام کا نعرہ ان کی کمزوری کا سبب بن رہا ہے کیونکہ ہر پارٹی کی نظام اسلام کی تعبیر مختلف ہے جس کی وجہ سے وہ آپس میں ٹکرا کر کمزور ہو گئی ہیں۔

اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکثر مسلم ممالک کی حکومتیں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں رہی ہیں۔ مطلق العنانی کے باوجود ان کی اکثریت نااہل ہے۔ اسلام پسند پارٹیوں کے دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے نہ سہی کم از کم عوام کے سامنے جوابدہ ہونے کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے دباؤ کا صرف یہ اثر غالباً اس صدی میں دیرپا ثابت ہو گا۔